طارق* پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ یوسف**

نسیم حجازی کے ناول اور ایثار و عمل کی ترغیب: ایک جائزہ

Abstract: *In his novels Naseem Hijazi offers various roles of individuals in the society. He presents such passions by which a human being undergoes the thorough process of accomplishing personality traits. These magnificent roles will always be remembered for their passions of sacrifice and steadfastness. In these roles Mohammad Bin Qasim, Tipu Sultan, Sultan Jallaluddin Khaarzam Shah, Baddar Bin Mughira, Muzam Ali and Khatiba Bin Muslim are mostly admirable. The history of Islam will always remember these greatest religious fighters. These heroes are still seem as the models of sacrifices and action where in there is much wisdom for common man to learn. This article analyses the roles of those valiant heroes of Naseem Hijazi in this perspective.*

نسیم حجازی کے ناولوں کے اکثر مرکزی کِردار تاریخ اسلامی میں اپنی بلند قربانیوں کے باعث اہم مقام رکھتے ہیں، اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کِردار قربانی و ایثار کا ایک ایسا نظریہ رکھتے ہیں، جو عقلیت سے قطع نظر محض ایمانیت کے دائرے میں اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں، دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی معرکے میں اہل اسلام و ایمان نے ہمیشہ ظاہری اسباب جنگ میں کمی کے باوجود اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس پر غور کیا جائے تو بنیادی سبب یہ ہے کہ حق کا اظہار اور پرچار ہمیشہ سے مشکل کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کا بھروسا اور وجہ اعتماد حق پر ایمان ہوتا ہے، اور یہی سب سے بڑی قوت بن جاتی ہے۔ اسی قوت کو وہ عمل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جب کہ اُس کے مدِ مقابل افراد اور اسبابی برتری کے زعم میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور اِن ہی اسباب پر بھروسا کرتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ ناکامی کو اپنا نقصان تصور کرتے ہیں اور یہ نقصان اُن کو ذہنی اور فکری سطح پر تباہ کر دیتا ہے۔ جب کہ حق پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھنے والے کسی بھی نقصان کو نقصان نہیں سمجھتے بلکہ ایثار اور قربانی تصور کرتے ہیں، اور ان کا جذبہ ایثار و قربانی انہیں مزید آگے بڑھنے کا مہمیز عطا کرتا ہے۔ رفتار کو تیز کرتا ہے، جستجو میں اضافہ کرتا ہے، کسی بھی قسم کی مایوسی کو قطعاً پیدا نہیں کرتا۔ اگر کرتا تو پھر اِسی نظریہ حق کے ساتھ تاریخ انسانی میں بار بار ایسے کِردار جنم نہ لیتے جو اسباب ظاہری کی کمی کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر عہد کے ظالم و جابر سے نئے عزم اور حوصلہ اور ایمان کے ساتھ ٹکراتے ہیں، اسے چیلنج کرتے ہیں، اسے شکست سے دوچار کرتے ہیں، بھلا وقت کے فرعون کو للکارنا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے نظریہ فرعونیت کو غلط کہنا کوئی معمولی فتح ہے۔

* اسسٹنٹ پروفیسر اینڈ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور

** چیئرپرسن، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور

یہ عظیم کِردار اپنی قربانی اپنے داخلی تصور کے باعث ایک زبردست قوتِ عمل رکھتا ہے۔ عمل میں استحکام اسی کے سبب پیدا ہوتا ہے۔

محمد بن قاسم:۔

نسیم حجازی نے محمد بن قاسم کی زندگی کی جو عکاسی کی ہے، اِس میں وہ فلسفہ حیات شامل ہے، جسے ہم ایثار و عمل کی راہیں متعین کرنا کہتے ہیں۔ محمد بن قاسم کی شخصیت اور اُس کی سوچ و فکر کو اُن حالات نے متاثر کیا، جب اُس نے سندھ میں رہنے والے افراد کو ذلت کی زندگی گزارتے دیکھا۔ جب کوئی شخص زندگی میں گزرنے والے واقعات کو زیادہ محسوس کرنے لگ جاتا ہے تو اُس کی فِطرت میں پھر یہ شامل ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف زندگی کی حقیقتوں پر غور و فکر کرنے لگ جاتا ہے، بلکہ زندگی کے الجھے ہوئے مسائل، انسان کی عظمت، اُس کی حیثیت یہاں تک کہ اِس کائنات میں اُس کا جو مقام ہے، یہ سب عوامل اُسے احساسِ کمتری کا شکار بنا دیتے ہیں یا پھر اُس کے اندر کچھ اِس انداز سے خود اعتمادی اپنی جگہ بنا لیتی ہے کہ وہ وقت کا دیوتا بن جاتا ہے، اور پھر اُس کے سامنے کوئی طاقت اپنے سر کو اُٹھا نہیں سکتی۔ لیکن جس شخص کے اندر یہ تمام خوبیاں ہوں لیکن پھر بھی عجز و انکساری اُس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو تو ایسا شخص اپنے ایثار و عمل کی بدولت اپنے سر کو کٹا تو سکتا ہے، لیکن جھکا نہیں سکتا۔ محمد بن قاسم نے اُس بے رحم حقیقت کو جان تو لیا تھا جو خلیفہ بغداد کی جانب سے اُس کی معزولی کا جو پروانہ اُسے سندھ میں عطا کیا تھا، وہ چاہتا تو بغاوت کر کے نہ صرف اپنی جان کو بچا لیتا بلکہ خلیفہ بغداد کے لیے بھی مشکلات کھڑی کر سکتا تھا، لیکن یہ عمل اُس کی فِکری سوچ کے متصادم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی یہ حرکت ملتِ اسلامیہ میں انتشار کا باعث بن سکتی ہے، اور امتِ مسلمہ اُس ردِ عمل کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہ تھی۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی تحریر کرتے ہیں،

> "سلیمان، حجاج کا بہت مخالف تھا، جیسے ہی وہ خلیفہ ہوا اس نے اس کے مقرر کیے ہوئے گورنر قیتبہ بن مسلم کو جو ترکستان کا گورنر تھا اور محمد بن قاسم کو جو سندھ کا گورنر تھا، مجرم قرار دیا اور محمد بن قاسم کو سندھ کی گورنری سے علاحدہ کر کے ۹۴ھ، (۱۵۔۷۱۴ء) میں سندھ کا گورنر یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو بنا کر بھیجا۔ یزید بن ابی کبشہ نے سندھ پہنچ کر محمد بن قاسم کو مجرموں کی طرح معاویہ بن مہلب کے ساتھ عراق بھجوا دیا، جب محمد بن قاسم سندھ سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے رخصت ہوتے وقت نہایت حسرت سے یہ شعر پڑھا!
>
> ترجمہ: لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جو ان کو ضائع کر دیا وہ جو ان کے مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کی مضبوطی کے لیے مناسب ہو"۔(۱)

نسیم حجازی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ تاریخی کِردار کو اُس کی حقیقت کے ساتھ اور دُرست واقعہ کو سامنے رکھ کر بیان کرتے ہیں، تاکہ قاری نہ صرف واقعہ کی اصل حقیقت کو جان لے، بلکہ کِردار کی بدولت اُس کا اصل عمل بھی سامنے آجائے، اب جو واقعہ محمد بن قاسم کی معزولی کا ہوا، اُسے آپ نے اپنے ناول میں ناول نگاری کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے اِس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کو ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ کِردار تاریخی عمل سے ہٹ گیا ہے۔ اب جو واقعہ جناب مولانا اعجاز الحق قدوسی نے بیان کیا ہے، اُس کو ذرا احساسات اور جذبات کے دائرہ میں کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے نسیم حجازی نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

"محمد بن قاسم نے جواب دیا،

> میری جان بچانے کے لیے آپ کتنے مسلمانوں کی جانیں قربان کرنا جائز سمجھتے ہیں؟ کیا اِس سے پہلے بصرہ کے لوگوں کی بغاوتوں نے عالمِ اسلام کو کافی نقصان نہیں پہنچایا؟ کیا میری تنہا جان اس قدر قیمتی ہے کہ اس کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی تلواریں آپس میں ٹکرا جائیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں؟ اگر میں عالم اسلام کو اس تباہی سے بچانے کے لے قربان بھی ہو جاؤں تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میری قربانی رائیگاں جائے گی۔ یہ مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ خلافت اب ملوکیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ تاہم مسلمانوں کا سوادِ اعظم اُسے خلیفہ تسلیم کرنے کی غلطی کر چکا ہے اور اس وقت میری بغاوت فقط خلیفہ سلیمان کے خلاف نہ ہو گی بلکہ قوم کے سوادِ اعظم کے خلاف ہو گی، لیکن ممکن ہے کہ میری قربانی کے بعد لوگ اپنی اس کمزوری کو محسوس کریں اور ان میں ایک ایسا اجتماعی ضمیر پیدا ہو جائے جو سلیمان کو راہِ راست پر لے آئے یا کم از کم سلیمان کے بعد وہ انتخاب کے معاملہ اس قدر سخت ہو جائیں کہ سلیمان جیسوں کے لیے آگے بڑھنے کا موقع نہ ہو۔ اگر میرے انجام سے متاثر ہو کر عوام نے یہ محسوس کیا کہ وہ امارت کو کسی کی خاندانی میراث تسلیم کرنے میں غلطی پر تھے اور انھوں نے سلیمان کے بعد اس کے کسی خاندانی وارث کی بجائے کسی صالح مسلمان کو خلیفہ منتخب کیا، تو یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے لیے قربان ہونا میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں"۔(۲)

جس طرح ہر معاشرے کی اپنی اقدار، عقائد اور رسم و رواج ہوتے ہیں، اِسی طرح اُس دور کا معاشرہ بھی اُن پابندیوں کو اختیار کر رہا تھا، جو سلیمان بن عبد الملک نے نافذ کیے تھے۔ اِس معاشرتی اور ذہنی دباؤ نے اُس پورے ماحول کو بدل کر رکھ دیا تھا، جو بنی امیہ کی اساس تھے۔ یوں معاشرتی انتشار نے پسندیدہ راہوں کو مسدود اور بری راہوں کے راستے کھول دیئے تھے۔ معاشرے کے ڈر سے افراد انہیں ترک کرنے پر آمادہ ہونے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ وہ افراد جو کسی بھی قسم کے معاشرتی دباؤ کو قبول نہیں کرتے، اور ہر اُس فکر سے انحراف کرتے ہیں، جو ظلم و زیادتی کی جانب جاتا ہوا ہو تو ایسے فرد کو خطاکار، منحرف، باغی اور مجرم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ محمد بن قاسم

بھی اِسی رجحان کا ایک ایسا فرد تھا جس نے مسلم اُمہ کے لیے اور امن و سکون کی خاطر اُس ایثار کا مظاہرہ کیا، جس نے آگے چل کر معاشرتی ضبط کو محسوس کرنا سکھایا۔ محمد بن قاسم کا یہ عمل صبر، حوصلہ اور عزم کی وہ داستان بن جاتا ہے، جہاں پر انسان کا حوصلہ ایک چٹان کی مانند نظر آتا ہے۔ ایثار و عمل کا پیکر محمد بن قاسم نے اپنے کِردار سے یہ ثابت کیا کہ وہ شعور کی اُس بلندی تک پہنچا ہوا ہے، جہاں صرف وہی افراد پہنچ پاتے ہیں، جو خدا کی قدرت کو سمجھ سکتے ہیں۔ انسان کے اندر موجود جبلت بعض اوقات اُسے اُس کا مستقبل دکھا دیتی ہے، اور یہ صلاحیت اُسی وقت جنم لیتی ہے، جب فرد زندگی کا مشاہدہ اُن اُمور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کرئے جہاں پر اُس کا رشتہ اُس کے رب سے مکمل طور پر جُڑ جائے۔ اور یہ عمل اُسی وقت پایہء تکمیل کو پہنچ پاتا ہے، جب انسان کے اندر ایثار جنم لیتا ہے۔ انسان کی طبیعت مختلف زمانوں میں مختلف حالتوں کا شکار ہوتی ہے۔ اب یہ اُس کے عمل سے واضح ہوتا ہے کہ زندگی میں وہ جو خواب دیکھتا ہے، وہ اُس کے کِس حد تک پورے ہوتے ہیں یا پھر وہ ہمیشہ تخیلات کی وادیوں میں کھو جاتا ہے۔ محمد بن قاسم جس مقصد کو لے کر سندھ کی جانب روانہ ہوا تھا۔ اُس کا عمل یہ متقاضی تھا کہ وہ ایثار و عمل کی وہ داستان بن جائے جو رہتی دنیا تک باقی رہے۔ وہ کیسا فرد تھا جو اپنی خواہش کو ایک ایسا المیاتی پہلو کا رنگ دے رہا تھا جو مکمل طور پر اُس کے احساسات و جذبات کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

> "زبیر! دیکھو یہ ستارہ کِس قدر اہم ہے، لیکن اِس کی زندگی کتنی مختصر ہے۔ یہ دنیا کو ہر صبح آفتاب کی آمد کا پیام دینے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سورج کے چہرے سے تاریکی کا نقاب اُلٹ کر اپنے چہرے پر ڈال لیتا ہے، لیکن اِس کے باوجود جو اہمیت اسے حاصل ہے، وہ دوسرے ستاروں کو حاصل نہیں اگر یہ بھی دوسرے ستاروں کی طرح تمام رات چمکتا تو ہماری نگاہوں میں اس کا رتبہ اس قدر بلند نہ ہوتا۔ ہم تمام رات آسمان پر کروڑوں ستارے دیکھتے ہیں، لیکن یہ ستارہ ہمارے لیے ان سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے عام ستاروں کی موت وحیات ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، بالکل ان انسانوں کی طرح جو دنیا میں چند سال ایک بے مقصد زندگی بسر کرنے کے بعد مر جاتے ہیں اور دنیا کو اپنی موت وحیات کا مفہوم بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ زبیر! مجھے اِس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے: اس کی زندگی جس قدر مختصر ہے، اِسی قدر اس کا مقصد بلند ہے۔ دیکھو! یہ دنیا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ میری عارضی زندگی پر اظہار تاسف نہ کرو۔ قدرت نے مجھے سورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور میں اپنا فرض پورا کر کے جا رہا ہوں۔ کاش! میں بھی اس ملک میں آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے صبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں"۔(۳)

محمد بن قاسم کی یہ خواہش کچھ اِس انداز سے پوری ہوتی ہے کہ عزم وہمت کا یہ پیکر جس نے اطاعتِ امیری میں اپنے صبر و ایثار سے اُس عمل کو جنم دیا، جو عقیدت کے مرکز تک جا پہنچتا ہے۔

ٹیپو سلطان

ٹیپو سلطان کی زندگی ایک ایسے اولوالعزم مجاہد کی داستانِ حیات ہے جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی۔ اُس کے دل و دماغ پر ہمیشہ یہ احساس غالب رہا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے" مسلمانوں کا دور انحطاط جب غیرت، عزت جاہ و جلال اور عزم و استقلال سب کچھ ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ ٹیپو سلطان ایک ایسا حکمران تھا، جو بہترین سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ عالم، مفکر، اور ایک عمدہ منتظم تھا۔ ٹیپو سلطان ایثار و عمل کا ایک ایسا پیکر تھا جو ماضی کی عظمتیں، حال کے جذبے اور مستقبل کی اُمیدوں پر ایک ایسی عمارت کی تعمیر کرنا چاہتا تھا جو زندگی کے ہر موڑ پر آگے ہو۔

نسیم حجازی ناول "اور تلوار ٹوٹ گئی" میں ٹیپو سلطان کی عظمت اور اُس کی وسعتِ نظر پر یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

> "اس نے ایک ایسے دور میں فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کیا تھا، جب کہ باقی ہندوستان کے نواب اور راجے اپنی رعایا کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کر رہے تھے۔ اس نے اس زمانے میں بین الاسلامی اتحاد کے لیے جدوجہد کی تھی، جب کہ عالم اسلام اپنے نا اہل حکمرانوں کی تنگ نظری، کمزوری، بے حسی اور باہمی رقابتوں کے باعث مغرب کے سامراجی بھیڑیوں کے لیے ایک عظیم شکار گاہ بن چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کے ایک ایسے پسماندہ علاقے میں اسلامی عدل و مساوات کے جھنڈے گاڑے تھے جہاں صدیوں سے جہالت اور افلاس کی تاریکیاں مُسلط تھیں۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو سے قبل میسور کے عوام کی کوئی تاریخ نہ تھی، لیکن ان کی حکمرانی کے چند برس پورے ہندوستان کی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں"۔(۴)

نسیم حجازی نے ٹیپو سلطان کی زندگی میں جب ایثار و عمل کو بنیادی عنصر قرار دیا تو ہمیں اِس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایثار و عمل اِس احساس کا نام ہے جو ٹیپو سلطان نے ساری زندگی محسوس کیا۔ ایک سیاسی اور سماجی شعور جو اُس وقت مکمل طور سے مسلمانوں میں ناپید ہو چکا تھا، غلامی سے نفرت اور استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ جو سلطان ٹیپو کا نصب العین بن چکا تھا، اپنے اندر ایک ایسی کشمکش رکھتا تھا، جو روح کی گہرائیوں تک میں اترتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ انسان خواہشوں کی تکمیل میں کس حد تک جا سکتا ہے، بے حسی، اور لالچ کس طرح اپنوں کو غیر بنا دیتی ہے ٹیپو سلطان اپنی آنکھوں سے اُس تصویر کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ سلطنت میسور کے ارد گرد جو واقعات تیزی سے رونما ہو رہے تھے، اُس نے ٹیپو سلطان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کیا معاشرے میں وہ حقائق جو اِس وقت سامنے نظر آ رہے ہیں، کیا وہ واقعی اپنے اندر وہی حقیقت رکھتے ہیں جو نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کے خلاف جو کامیابیاں انگریزوں نے حاصل کیں اُن میں غدارِ اِن ملت اور بکاؤ درباریوں کی مذموم کارستانیوں کا بڑا عمل دخل رہا تھا۔ معاشرے کا انتشار، مفاد پرستی اور نااہل حکمرانوں کی ریشہ دوانیوں نے ٹیپو سلطان کو حد درجہ مغموم رکھا۔

"نظام کا اِس جنگ میں شریک ہونا خالصتاً ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ تاہم درباری گویے، شاعر اور خوشامدی اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اپنے دور کا سب سے بڑا غازی ہے۔ فتح کی اُمید پر فتح کے جشن شروع ہو چکے تھے۔ میر نظام علی رقص و سُرور کی محفلوں میں مرہٹہ راجوں اور چیدہ چیدہ سرداروں کے درمیان میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ شراب کے دور چلتے تھے۔ رقاصاؤں، گویوں اور سازندوں پر سونے چاندی کے سکوں کی بارش ہوتی تھی اور پھر جب یہ محفلیں برخاست ہوتی تھیں اور یہ لوگ کسی خیمے میں جمع ہو کر جنگ کی تجاویز پر غور کرتے تھے تو سب سے زیادہ بحث اِس بات پر ہوتی تھی کہ فتح کے بعد میسور کی زمین اور خزانے کس طرح تقسیم ہونے چاہئیں۔ قریباً ڈیڑھ ماہ کی بحث و تمحیص کے بعد میر نظام علی اور مرہٹہ حکمرانوں کے مابین جنگ کی تفصیلات اور مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق سمجھوتہ ہو چکا تھا اور پڑاؤ میں ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ حیدرآباد اور پونا کے ایک عام سپاہی سے لے کر بڑے افسر تک ہر شخص کی آواز یہ تھی کہ اب کی سلطان ٹیپو کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں"۔(۵)

ٹیپو سلطان نے ہندوستانی معاشرے میں موجود اُن ناسوروں کی نشاندہی کی بلکہ اِس فرض پر اپنی زندگی کو ہی قربان کر دیا۔ ایک ایسا شخص جو سسکتی ہوئی انسانیت کے لیے فکر و نظر کا ایک نیا زاویہ لے کر آیا۔ ہمیں آزاد پسندی کی لہر کو سمجھنے کا سبق دیا۔ جس کا کرب ہم آج تک اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ اُس کی بد قسمتی تھی کہ اُس وقت جب اُسے دوستوں کی ضرورت تھی، تب نہ فرانس جو خود انقلابی اثرات کی وجہ سے زبوں حالی کا شکار تھا، بلکہ سلطنتِ عثمانیہ کا رعب و دبدبہ بھی زبوں حالی کا شکار تھا۔ جب انسان زماں و مکاں سے لاتعلق ہو جاتا ہے تو پھر وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا ہُنر سیکھ جاتا ہے۔ ٹیپو سلطان کی ساری زندگی کا جو بنیادی نکتہ پوشیدہ ہے، وہ اُس خاص کیفیت کا نام ہے، جسے ہم آزادی کی اُمید قرار دیتے ہیں، مسلمان حکمرانوں کی غفلت، دنیا پرستی، بے حسی اور سلطان کی بے بسی نے اِس احساس کو اُجاگر کیا ہے کہ اقوام کی زندگی میں اگر اُن کے حکمران بے خوف اور دلیر ہوں تو وہ موت کو زندگی کی طرح گلے لگا لیتے ہیں۔

"۔۔۔ایک گولی سلطان کے گھوڑے کے پیٹ میں لگی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا۔ گھوڑے کے ساتھ گرتے وقت سلطان کی دستار اس کے سر سے علیحدہ ہو گئی۔ سلطان لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا لیکن ابھی وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اس کے سینے پر گولی لگی اور وہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ پاس ہی ایک انگریز نے سلطان کی کمر سے تلوار کی مرصع پیٹی اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن شیر میسور میں ابھی زندگی کے چند آخری سانس باقی تھے اور وہ یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ سلطان نے اچانک اُٹھ کر تلوار بلند کی اور پوری قوت کے ساتھ اُس پر وار کر دیا۔ انگریز نے اپنی بندوق آگے کر دی۔ سلطان کی تلوار بندوق پر لگی اور ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور انگریز سپاہی نے اپنی بندوق کی نالی کا سرا سلطان کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے فائر کر دیا اور وہ آفتاب جس کی روشنی میں اہل میسور نے آزادی کی حسین منازل دیکھی تھیں، ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا"۔(۶)

آج اگر ہم دورِ حاضر پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں آج ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ہمارے درمیان کہیں پر نظامِ دکن، مرہٹہ اور میر صادق جیسے غدار وطن فروش موجود ہیں، جن کے مخصوص مفادات اور متعصبانہ دائرہ کار اور وسعت نظری سے محرومی نے ایک بار پھر ہمیں اُسی دور میں لا کھڑا کیا ہے۔

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ

اسلامی تاریخ میں کچھ ایسی شخصیات گزری ہیں، جنھوں نے اپنے عمل اور کِردار سے یہ ثابت کیا ہے کہ وقت چاہے کتنا بھی مخالف ہو جائے اگر مقصد کے حصول کے لیے جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں، لیکن ہمیں حیرت اُس وقت ہوتی ہے جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں تاتاری یورش کے درمیان ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے، جو اپنے ایثار و عمل سے مکمل طور پر سالہاسال تک کامیابی سے تاتاریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور وہ ہے، سلطان جلال الدین خوارزم شاہ جو ایک طرف تو اقوام عالم کے محسن ہیں، تو دوسری جانب ایک ایسے حکمران جو اپنی سیرت و کِردار کے لحاظ سے بہترین منتظم اور رزمگاہ کے سپاہی بھی تھے۔ چٹانوں جیسی سخت جانی اور اٹل عزائم رکھنے والا شخص تو ایک ایسا دردمند دل رکھنے والا انسان جو ہر وقت عالمِ اسلام کی خیر خواہی سوچتا ہو۔

مولانا محمد اسماعیل ریحان لکھتے ہیں،

> "سلطان جلال الدین کی ناقدری کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ سلطان بظاہر اپنی جدوجہد میں ناکام نظر آئے، اور ان کی تمام تر کوشش اور محنت کے باوجود انجام کار میدان تاتاریوں کے ہاتھ میں رہا۔ اگرچہ یہ ظاہری فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ ہی سلطان جلال الدین جیسا مجاہد اس کو مقصود سمجھتا ہے، بلکہ وہ تو فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر فرض کی تکمیل کے لیے موت کے منہ میں کود جاتا ہے۔ مگر لوگوں کی نگاہیں فتح و شکست کے ظاہری مناظر میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ چڑھتے سورج کو سلام، کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لیے سلطان کو اِس عمومی تاثر کے تحت ایک ناکام انسان سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اگر سلطان تاتاریوں کو حتمی شکست دینے میں کامیاب ہو جاتے تو بلاشبہ انہیں بھی سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان محمود غزنوی کے ہم پلہ تسلیم کیا جاتا"۔(۷)

سلطان جلال الدین، ایثار و قربانی اِن کا خاص وصف تھا۔ تاتاری یلغار کے دوران اِن کی دنیا صرف شمشیر وسناں تھی۔ ایثار و عمل کا اس سے زیادہ اور کیا مظاہرہ ہو گا کہ ایک بہن تاتاریوں کی ہوس کا ساری زندگی نشانہ بنتی رہی تو ساری آل و اولاد بیوی خاندان کی قربانیوں کی لازوال تاریخ رقم کی، لیکن اپنے مقصد کو کبھی بھی پس پشت نہیں رکھا۔ سلطان جلال الدین جس طرح میدانِ جنگ میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے تھے، اسی طرح وہ بڑے سے بڑے معرکے سے نہیں گھبراتے تھے، اور وہ شخص جب تنہائی میں بیٹھتا تھا تو اللہ کے خوف سے کانپ اٹھتا تھا، آپ کی زندگی میں کئی ایسے موقع آئے جب آپ تنہائی میں بیٹھ کر زار و قطار روتے تھے۔

علاؤالدین ذہبیؒ فرماتے ہیں،

"بسا اوقات وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے زار و قطار روتے تھے"۔(۸)

ایثار و عمل کا یہ پیکر جس کی طبیعت میں ضبط نفس، ہمت و حوصلہ اور جذبات نمایاں تھے، زندگی میں آنے والے مسلسل حوادث نے انہیں نڈھال کر کے رکھ دیا تھا، تاتاریوں نے اُن کے اہل خانہ کے ساتھ جو سلوک رکھا اور جس بے دردی کے ساتھ انہیں قتل کیا تھا، یہ زخم وہ کبھی بھلا نہ سکے۔ نظم و ضبط جو اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، آخر دم تک برقرار رہا۔ حالات و واقعات سے اور جب وہ مسلم حکمرانوں کی بے حسی سے پریشان اور نااُمید ہو گئے تو بجائے اِس کے کہ وہ اپنی زندگی کا خود خاتمہ کر لیتے انہوں نے ایک ایسی راہ کو منتخب کیا، جو انہیں عزت و مرتبہ کا مقام عطا کر گئی اور آج ہمیں یہ سوچنے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ شاید ہم آج بھی اُسی صورتحال میں زندہ رہ رہے ہیں۔

معاشرے کی مردہ پرستی، اضطراب و بے چینی نے سلطان جلال الدین کے اندر جس مایوسی کو جنم دیا تھا، اُس نے انہیں اضمحلال میں مبتلا رکھا۔

"سلطان نے کہا،

عبدالملک! عزت کی موت کے لیے مجھے ساتھی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دنیا کے تمام آلام کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے چین نصیب نہ ہو سکا۔ میں نے نغموں کی تانوں میں سونے کی کوشش کی لیکن تلواروں کی جھنکار میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ برف باری کے طوفان میں روپوش ہو گیا اور اِس کے بعد کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟۔۔۔۔

بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ ایک عام سپاہی کے لباس میں تاتاریوں کی کسی چوکی پر حملہ کرنے کے بعد شہید ہو چکا ہے اور بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اسے قوم کے کسی غدار یا تاتاریوں کے کسی جاسوس نے قتل کر دیا ہے۔

بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ آہستہ آہستہ اِس بات پر یقین کرنے لگے کہ شیر خوارزم اِس دنیا میں نہیں"۔(۹)

تاریخ کی یہ نامور شخصیت اپنے ایثار و عمل سے ایک ایسے کردار میں ڈھل چکی تھی جس نے اپنے پورے احساسات و جذبات کے ساتھ وقت کے سب سے ظالم حکمران سے ٹکراتے ہوئے انسان کو زندگی و موت کا ایک ایسا فلسفہ سمجھایا جو رہتی دنیا تک ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

بدر بن مغیرہ (شاہین)

بدر بن مغیرہ جسے تاریخ میں شاہین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اُس دور کا کردار ہے، جب اُندلس میں لاکھوں مسلمان اپنی جان و مال اور شناخت کو بچانے کے لیے اُس دوزخ سے گزر رہے تھے، جسے زوال اُندلس کہا جاتا ہے۔ جب نابالغ بچے چھین لیے گئے، ہزاروں کو آگ میں جلادیا گیا، نامعلوم تعداد کو بدترین اذیتیں دی گئیں، ہزاروں عورتوں کو اِس طرح پیٹا گیا کہ اُن کی کھال اُن کے جسم سے جدا ہوگئی، اور عالم اسلام ایک ٹھنڈی اور میٹھی نیند سویا ہوا تھا۔ حالات کا اندازہ اور سیاسی زوال ہم اِن حقائق سے لگاسکتے ہیں،

> "مسلمانوں کو اُندلس پر قابض ہوئے قریباً آٹھ صدیاں گزر چکی تھیں۔ ان آٹھ صدیوں کی تاریخ ایک عظیم قوم کے عروج اور زوال کی داستان ہے جس کا پہلا باب عرب فاتحین اور اموی خاندان کے جلیل القدر حکمرانوں نے اپنے خون کی روشنائی سے لکھا تھا۔ اب یہ عظیم قوم جس کی سطوت بحیرہ روم کی سرکش لہروں پر سکوت طاری کردیا کرتی تھی، جس کی اولوالعزمی کے سامنے کوہِ پیرنیز کی بلند چوٹیاں سرنگوں ہوجایا کرتی تھیں بے کسی کے آنسوؤں سے اپنی تاریخ کا آخری باب لکھ رہی تھیں۔ تہذیب و تمدن کا وہ درخت جسے طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر جیسے جانبازوں اور عبدالرحمٰن کے جانشینوں نے پروان چڑھایا تھا، بادِ خزاں کے تند و سرکش جھونکوں کا سامنا کررہا تھا"۔(۱۰)

بدر بن مغیرہ کی شخصیت اِس بات کی غمازی کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ انسان کے لیے چاہے جتنی بھی مشکلات درپیش ہوں، لیکن اُس کا کِردار ہمیشہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ جب ہم بدر بن مغیرہ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو، یہ سپاہی ہمیں جہاں ایک جانب دن رات غرناطہ کی حفاظت کرتا ہوا نظر آتا ہے وہیں دوسری جانب خود غرض امراء کی باہمی خلفشار سے نپٹنے کے لیے انہیں نہ صرف سمجھاتا ہے، بلکہ اپنی حیرت انگیز بہادری کے سبب وہ عوام میں عقاب کے نام سے مشہور بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ جب بھی کوئی شخصیت بے لوث خدمت کرتی ہے تو دنیا نے اُس کے ایثار و عمل کو نہ صرف حقیر جانا بلکہ اُس کی قدر بھی نہ کی۔ یوں ایسی قوم اقوامِ عالم میں ذلیل و رسوا ہوکر گم نامی میں بدل جاتی ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی محنتی، مخلص اور اپنے کام سے محبت کرنے والا ہو، لیکن جب تک اُس کی قوم اُس کا ساتھ نہ دے ایسا شخص کچھ نہیں کرسکتا۔ بدقسمتی سے بدر بن مغیرہ بھی اِسی قوم کا ایک ایسا سپہ سالار تھا جو نہ تو خود جاگنا چاہتی تھی اور نہ ہی خود کو کسی بھی مشکلات سے نکلنے کی آرزومند تھی۔ غرناطہ جس نے زوال کی آخری حد تک پہنچتے ہوئے بھی تقریباً ڈیڑھ صدی تک دنیا کو دانش، خوشحالی اور حکمت کے وہ موتی دیئے جنھوں نے صدیوں بعد بھی دنیا کی رہنمائی کی۔ معاشرے میں عدم تحفظ اور عدم توازن نے ایک ایسے حکمران کو مسندِ اقتدار پر بٹھادیا جس کی زندگی میں حرارت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ جب عوام بے حس اور مجرمانہ حد تک خاموش ہوجائیں تو اُن کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے۔

"تم نے ایک نااہل کو غرناطہ کے تخت پر قابض ہوتے دیکھا اور خاموش رہے۔۔ میرے دوستو! قوم کا راہنما قوم کے کِردار کا آئینہ ہوا کرتا ہے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ ابو عبداللہ بے حس ہے تو تم اِس قوم کے متعلق کیا کہو گے جس نے اُسے اپنا حکمران تسلیم کر لیا تھا۔۔۔

یاد رکھو! جب مستقبل کا مؤرخ یہ لکھے گا کہ ابو عبداللہ ایک غلط اندیش اور پست ہمت انسان تھا تو اُسے یہ بھی لکھنا پڑے گا کہ ابو عبداللہ کی قوم میں ذلیل انسانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا تھا جس نے اپنے مخلص، بہادر اور دانشمند حکمران سے غداری کر کے اس کے نالائق اور بزدل بیٹے کو اپنا راہنما تسلیم کر لیا ہے۔۔(۱۱)

جس طرح انسان کی ذات میں مختلف روپ چھپے ہوتے ہیں، اِسی طرح بدر بن مغیرہ کی ذات میں ایثار و عمل کا عنصر سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں ہمیشہ یہ ہی کوشش رہی کہ مسلم ہسپانیہ کو ایک ایسی فکری قوت عطا کی جائے، جو مذہبیت اور قومیت کے ساتھ ساتھ اپنی پہچان کو جان لے۔ وہ سفر جو طارق بن زیاد سے شروع ہوا تھا، جب بدر بن مغیرہ تک آپہنچا تو اُس وقت تک مسلم ہسپانیہ کی زندگی کا کوئی رُخ متعین نہیں تھا۔ اِس حقیقت پسندی نے انہیں اس کا احساس دلایا کہ انسان کبھی تخیل کی فضا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُسے جب زندگی کے مقاصد کو حاصل کرنا ہو تو ایک آزاد اور خود مختیار زندگی بسر کرنا لازمی ہے، اور اس کے لیے انہیں آزادی کا احساس ضرور یاد دلانا چاہیئے، اور اِسی ادراک کو جانتے جانتے بدر بن مغیرہ اِس دنیا سے رخصت ہو گیا، لیکن پوری مسلم ہسپانیہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اُس کے وہ الفاظ جو اُس نے اپنی شہادت سے چند لمحے پہلے ادا کیے، یوں اِس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اُسے آخری دم تک صرف اور صرف اپنی قوم کی فکر تھی۔

"طلوعِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد بدر بن مغیرہ نے اپنے تیمارداروں پر آخری نگاہ ڈالنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں اور نحیف آواز میں کہا، منصور میں اپنا ادھورا کام تمہیں سونپتا ہوں۔ تم اس وقت تک دشمن کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول رکھو جب تک کہ باقی ملک کے مسلمان مراکش نہیں پہنچ جاتے۔ اگر تم نے ہتھیار ڈال دیئے تو دشمن چاروں طرف سے مطمئن ہو کر اپنی ساری قوت مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنے میں صرف کر دے گا۔ بشیر! مراکش میں یہاں کے یتیم بچوں اور بیواؤں کے لئے جائے پناہ تلاش کرنے کا کام میں تمہیں سونپتا ہوں۔ تمہاری یہاں بھی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہ کام بہت ضروری ہے۔ ابو محسن مجھے یقین ہے کہ تمہاری رفاقت میں منصور یہ محسوس نہیں کرے گا کہ میرے بعد وہ اکیلا ہے۔ میرا وقت آچکا ہے میری منزل مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ اِنا اللہ واِنا الیہ راجعُون"۔(۱۲)

بدر بن مغیرہ کی شہادت اپنے اندر اُن تلخیوں کو محسوس کراتی ہے، کہ کسی بھی قوم کے اجتماعی گناہ قابلِ معافی نہیں ٹھہرائے جاتے۔

معظم علی

معظم علی ایک ایسا کردار جو آرزوؤں، اُمیدوں اور جذبوں کا محور ہے۔ زوال پذیر قوم میں احساسات کی ایک ایسی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے، جس نے وقت اور حالت کو اپنی سیرت و کردار کی بدولت مہیب تاریکی میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو امید کا دامن تھامنا سکھایا۔ جب آزادی اور حُریت کے پرچم چاروں جانب سرنگوں ہو رہے تھے، معظم علی نے اسے اپنے ایثار و عمل سے اپنا خون دے کر بلند رکھا۔ مِلت کے شہیدوں کی لاشوں پر وطن فروشوں نے جو مسندیں بچھائی تھیں، معظم علی بنگال کی سرزمین کا ایک ایسا سپوت جس نے اسلام کی سربلندی اور جذبہ حب الوطنی کو پیدا کیا۔ انسان جس طرح خوشی کے احساسات اور جذبات کو اُس وقت سمجھ پاتا ہے، جب تک وہ اِس لہر کو اپنی روح تک میں اُترتے ہوئے محسوس نہ کرے، اِسی طرح دُکھ کا وہ رنگ جو اپنی پوری شدت کے ساتھ معظم علی کے اندر سرایت کر گیا تھا، یہ وہ فطری عمل تھا، جس نے معظم علی کو ایثار و عمل کا ایک ایسا مجسمہ بنا دیا، جو اپنی جبلت کے ماخذ اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک ایسی ذہنی کرب میں مبتلا تھا، جس کا مداوا ممکن نہ تھا، استحصالی قوتوں نے مکمل طور پر مسلمانوں کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ معظم علی نے ساری زندگی اِس بات کی کوشش کی کہ مسلم معاشرے میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ اپنی کوتاہیوں کو چھپایا یا دبایا نہ جائے، بلکہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی طور پر جدوجہد جاری رکھی جائے۔ زندگی کے وہ رنگ جو معظم علی کے سامنے آئے تھے، ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کی جانب اشارہ کر رہے تھے، جس میں قدم قدم پر اُسے ایثار و عمل کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ معظم علی میں بسنے والی روح ہر وقت بے چین سی رہتی تھی۔ اِس لیے وہ آزادی کے قائل تھے، ایک ایسی آزادی جہاں حوصلہ مندی زندگی کی بنیاد کہلائے۔ انسان دشمن عناصر کو سختی سے کچل دیا جائے۔ ذہنی اعتبار سے آپ ہمیشہ ارتقائی عمل کو پسند کرتے تھے، معظم علی ایک دور اندیش انسان تھا، مسلمانوں کے ذہنی تضادات پر غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ آنے والی مشکلات پر بھی گہری نظر رکھتا تھا، انہیں اِس بات کا بھی احساس تھا کہ دنیا میں محبت کے بغیر زندگی کا سفر انتہائی دشوار ہے۔ نسیم حجازی نے ناول معظم علی میں معظم علی کے کردار کو انفرادیت، جذباتیت کے علاوہ بے باکانہ اظہارِ رائے کا پیکر قرار دیا، اِن کی شخصیت میں جو بے سکونی پائی جاتی تھی اُس نے اُسے زندگی کے نشیب و فراز میں پہچانا۔ آپ نے افراد کی حسرتوں کا خون ہوتے دیکھا، ایک ایسی جدوجہد دیکھی جس کی بظاہر کوئی منزل نہ تھی۔

> "یہ جنگ کسی حکومت یا فوج کے خلاف نہ تھی بلکہ ان انسانوں کے خلاف تھی جن کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ کسی میر جعفر، کسی شجاع الدولہ یا کسی نظام علی خاں، جیسے ملت فروش کے اطاعت گذار تھے۔ روہیلکھنڈ کی سرزمین اس شریف، بہادر اور غیور قوم کے فرزندوں کے خون سے لالہ زار تھی، اور روہیلکھنڈ سے باہر اس قوم کی بے بسی کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ مہاجرین کے قافلے اپنی جنم بھوم چھوڑ کر پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کا ماضی اجڑی ہوئی بستیوں، بے گور کفن لاشوں اور لُٹی ہوئی عصمتوں کی داستانوں سے لبریز تھا۔ چند دنوں

کے اندر اندر ایک لاکھ انسان جلاوطنی کی حالت میں غربت، افلاس، قحط اور طرح طرح کی وباؤں کا سامنا کر رہے تھے۔ نواب وزیر اودھ اس بات پر خوش تھا کہ اُس کی سلطنت میں ایک سرسبز وشاداب خطہ زمین کا اضافہ ہو گیا ہے انگریز خوش تھے کہ ہندوستان کا ایک بازوئے شمشیر زن کٹ چکا ہے اور مرہٹے خوش تھے کہ وہ لوگ جو کسی وقت دلی میں اِن کے مدمقابل بن سکتے تھے، پوری طرح مغلوب ہو چکے ہیں"۔(۱۳)

نسیم حجازی نے معظم علی کے ایثار و عمل کی ترجمانی کرتے ہوئے اُس ماحول کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے، جہاں محرومیاں، خواہش، ایذائیں اور زندگی کے تلخ حادثات کی بھی وجوہات اور اثرات دیکھائے ہیں۔ انگریزوں کی آمد نے جو ظلم و ستم ڈھائے اُس نے ایک تباہ کن رجحانات کو پیدا کیا، یہ صحیح ہے کہ زمانے کے ظلم و ستم اور تیز و تند ہواؤں نے معظم علی کے ارادوں کو کبھی متزلزل نہیں ہونے دیا۔ ناکامی اپنی جگہ لیکن اصل چیز وہ جذبہ ہے، جو معظم علی کی زندگی کا مقصد تھا۔ مسلمان تباہ و برباد ہو چکے تھے، موت بے حد ارزاں ہو چکی تھی، چاروں جانب ایک گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔ اِن حالات وواقعات کے بیان کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ حقائق سامنے لائے جائیں، جن کی بدولت معظم علی نے زمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسا کردار ادا کیا، جہاں ایثار و عمل، صبر و استقامت اور جذبوں کی بدولت وہ آج بھی تاریخ کا ایک اہم کردار ہے، جس نے سلطان ٹیپو کے ساتھ مل کر اپنے وطن اور مسلم قوم کو بچانے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دی۔ معظم علی بڈنور کی جنگ میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ معظم علی کا ایثار و عمل اِس سے اور کیا زیادہ ظاہر ہو گا کہ وہ آخری لمحوں میں بھی اپنی بیوی کو جو خط لکھتا ہے اُس میں بھی اِسی پہلو کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

"۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام تمھاری رفاقت اور تمھاری رفاقت سے پہلے تمھاری یاد میں گزارے۔۔ مجھے تمھارے بچوں کے لیے ایک ایسے وطن کی تلاش تھی جہاں وہ عزت اور آزادی کی زندگی بسر کر سکیں اور میسور میرے خوابوں کی جنت ہے۔ ایک بڑی آرزو کی تکمیل کے لیے عظیم قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میرا اور میرے بیٹوں کا خون میسور کے اَن گنت مجاہدوں کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں جو قوم کی عزت اور ناموس پر قربان ہو چکے ہیں۔۔۔۔ لیکن اب یہ حقیقت مرا جزو ایمان بن چکی ہے کہ جو مجاہد فتح و شکست سے بے پرواہو کر کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے جان دیتے ہیں ان کی قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔۔ قیامت کے دن مختلف ادوار میں حق و انسانیت کے لیے قربانیاں دینے والے لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے اور میری آخری دعا یہ ہے کہ یوسف، آصف، افضل میرے اباجان اور صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی حق پرستوں کی اسی صف میں کھڑے ہوں"۔

تمہارا شوہر (۱۴)

مسلم حکمرانوں کی مردہ پرستی اور ظلم و زیادتی کے اِس طوفان میں معظم علی ایک ایسی چٹان ثابت ہوا، جس کے ہٹتے ہی سلطان ٹیپو کی شہادت کی راہ ہموار ہو گئی۔ بہر حال معظم علی داخلی و خارجی دباؤ کے باوجود اُس نے اپنی منزل کو پالیا اور زوال پذیر معاشرے میں اپنے ایثار و عمل کی بدولت ایک تاریک رات میں چمکتا ہوا ستارہ بن گیا۔

قتیبہ بن مسلم

قتیبہ بن مسلم تاریخ کا ایک ایسا کردار ہے، جس نے اپنے عزم و حوصلے سے مسلمانوں کے لیے وہ راستے کھول دیے، جن پر چل کر ہم آج بھی اپنے حال کو پُر امید اور مستقبل کو شاندار بنا سکتے ہیں، قتیبہ بن مسلم نے اپنے ایثار و عمل سے ستم رسیدہ اور استحصال زدہ معاشرے میں احساس کا وہ جذبہ پیدا کیا کہ جس نے آنے والے وقت میں سسکتی ہوئی انسانیت کی آبرو اور ایک نیا نقطہ نظر پیش کیا۔ قتیبہ بن مسلم نے ولید کے زمانے میں شاندار فتوحات حاصل کیں، آج جو وسط ایشیاء میں ہمیں اسلام نظر آتا ہے، اُس کا سہرا قتیبہ بن مسلم کے سر جاتا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی، دنیا کا ایک وسیع و عریض خطہ زیریں نگیں آ گیا تھا، چین کی جانب پیش قدمی جاری تھی، اسپین فتح ہو چکا تھا، غرض دنیا اُن کی مٹھی میں تھی، اور یہ سب کچھ اِسی لیے ممکن ہو سکا کہ آپس میں اتحاد و اتفاق کی طاقت تھی۔ اطاعتِ امیر زندگی کا لازمی حصہ تھا، حالات چاہے جیسے بھی ہوں، اپنے ایثار و عمل سے یہ ثابت کرنا تھا کہ زندگی کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ معاشرے کا چاہے عروج ہو یا زوال، اطاعتِ امیری میں اخلاقی قدریں کبھی پامال نہ ہوں۔ چاہے جان چلی جائے۔ قتیبہ بن مسلم بھی اُس وقت اِسی دورا ہے پر کھڑا تھا۔

قتیبہ بن مسلم کا زمانہ سیاسی طور پر مکمل طور سے ایک تبدیل ہوتا ہوا زمانہ تھا، اسلام نے جس شخصیت پرستی اور تعصب کو دور کیا تھا، ولید کی وفات کے بعد سلیمان کی جانشینی نے اُسے دوبارہ زندہ کر دیا تھا، حسد، انتقام کی آگ نے سلیمان کو یہ سوچنے کا موقع نہ دیا کہ وہ سلطنت جس کی حدود اب کاشغر سے لے کر سندھ تک پھیل چکی ہیں، اُس کی سوچ کی بدولت مسلم سلطنت کو کس حد تک نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انسان کی جبلت اُس سے کیا کیا کام کرواتی ہے، ہمیں بنو امیہ کی تاریخ اور خاص طور پر سلیمان کا عہد بتاتا ہے۔ حالات و واقعات نے قتیبہ بن مسلم کا ساتھ نہ دیا تھا، اور وہ شہادت کے درجے پر فائز ہو گیا۔ قتیبہ بن مسلم کی شخصیت اُن تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آتی ہے، جو اُس وقت مسلم معاشرے اور تبدیل ہوتا ہوا معاشرے کا تقاضہ تھا۔

جب قتیبہ بن مسلم کو یہ گمان گزرا کہ اُسے واپس بلا کر محمد بن قاسم کی طرح قتل کر دیا جائے گا تو اُس کی سوچ نے کسی بھی قسم کا نتیجہ ظاہر ہونے سے پہلے ہی جو ردِ عمل دکھایا اُس نے اُس کو اُس کی اپنی زندگی سے محروم کر دیا۔

حالات کے جبر کو سمجھنا اور پھر اُسے اُسی شدت سے قبول بھی کرنا ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ قتیبہ بن مسلم جو ایک عظیم سپہ سالار تھا، صرف اِس لیے شہادت کے رتبے پر فائز ہو گیا کہ اُس کا گمان خلیفہ سلیمان کے لیے مناسب نہ تھا۔

"قتیبہ بن مسلم کے قتل پر ایک خراسانی نے اپنے ایک عرب دوست سے کہا تم لوگوں نے قتیبہ کی یہ عزت کی کہ اسے قتل کر دیا۔ اگر یہ شخص ہمارے ملک میں ہوتا تو ہم اِس کو ایک تابوت میں محفوظ کر لیتے اور اِس کی زیارت سے سیر اب ہوتے اور اس کی برکت سے لڑائیوں میں فتح یاب ہوتے"(۱۵)

قتیبہ بن مسلم اِس فکر کے حامل تھے کہ انسانی ذات سے منسلک حرکات و سکنات کا نفسیاتی طور پر بغور مطالعہ کرتے تھے، اِسی لیے ولید کے انتقال اور سلیمان کی تخت نشینی نے جب بڑے بڑے سپہ سالاروں کو معزول اور شہید ہوتے دیکھا تو آپ کے دل میں بھی سلیمان کے لیے ایک ایسی گرہ لگ گئی، جو آخری دم تک آپ کے ساتھ رہی۔ اِس احسان فراموش معاشرے نے آپ کے ساتھ بہت ظلم کیا،

"۔۔۔۔۔ مگر قتیبہ کے دل میں اس قدر بدگمانی پیدا ہو چکی تھی اور اپنی طاقت اور اپنے قبائل کی فرمانبرداری پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے سلیمان کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا اور حکومت کا پروانہ ملنے سے پہلے ہی علم بغاوت بلند کر دیا۔ اپنے ماتحتوں کو ترغیب دی کہ وہ خلیفہ کی بیعت توڑ دیں لیکن خلافِ امید کسی نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ یہ رنگ دیکھ کر وہ سخت برہم ہوا اور قتیبہ بن تمیم پر بڑا ناراض ہوا۔ اس کا اثر الٹا ہوا اور خود قبیلہ بنی تمیم اِس کے خلاف ہو گیا اور وکیع بن الاسود کو اپنا سردار بنا کر مقابلہ پر آ گیا۔ کئی ہزار اہل عجم نے بھی بنی تمیم کا ساتھ دیا۔ دونوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ قتیبہ نے شکست کھائی اور خود اس کے بھائی اور لڑکے مارے گئے۔ اس کا سر کاٹ کر سلیمان کے پاس بھیج دیا گیا۔ افسوس کے بدگمانی کی وجہ سے مسلمان اپنے ایک نامور اور بہادر سپہ سالار سے محروم ہو گئے"۔(۱۶)

بلاشبہ قتیبہ بن مسلم ایک عظیم فاتح تھا، جس نے بنو امیہ کی سلطنت میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اپنی بہادری اور شجاعت کی بدولت تاریخ اسلام اس پر فخر کر سکتی ہے۔

نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے ذریعے ایثار و عمل کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ نہ صرف اُس وقت کے حالات و واقعات کی عکاسی کرتی ہے۔ بلکہ اگر ہم موجودہ دور کی بات کریں تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ تاریخ اسلام کے عظیم مجاہدوں کا ایثار و عمل ہمیں آج بھی نئے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں ایک طرف ان شخصیات نے اپنا کردار ادا کیا وہیں پر ہزاروں ایسے افراد بھی تاریخ میں گمنام ہیں، جنھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ زندگی کی حقیقت چاہے کچھ بھی ہو، تغیر زمانہ چاہے جتنا بھی مخالف ہو جائے، لیکن آنے والے وقت اور آنے والی نسل کے لیے یہ پیغام ضرور موجود ہونا چاہئے کہ جب انسان صبر اور استقامت پر قائم رہتا ہے تو ایک کامیاب اور سچے جذبے کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

نسیم حجازی نے جب کسی بھی بڑے واقعہ کو تاریخی ناول کا روپ دیا تو آپ نے اُن گمنام افراد کا ذکر ضرور کیا، جنھوں نے صرف موت کو گلے اِس لیے لگایا کہ آنے والی نسلیں انہیں غدار اور ملت فروش نہ کہیں اُن کا یہ ایثار اُسی شدت کے ساتھ ہمیں آج بھی روح کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ایثار و عمل کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو گی کہ ہم آج جس ملک میں رہ رہے ہیں اُس کی بنیادوں میں لاکھوں انسانوں کا خون شامل ہے، جنھوں نے اپنی خوشی سے ایثار و عمل کو قبول کر کے اپنی جان خدا کے حوالے کی۔

حوالہ جات:

۱۔ سندھ کی تاریخی کہانیاں، مولانا اعجاز الحق قدوسی، جلد اول ص83۔
۲۔ محمد بن قاسم، نسیم حجازی، جہانگیر بکس، کراچی، ص384، 385۔
۳۔ ایضاً، ص305۔
۴۔ اور تلوار ٹوٹ گئی، نسیم حجازی، جہانگیر بکس، کراچی، ص506۔
۵۔ ایضاً، ص119، 118۔
۶۔ ایضاً، ص495۔
۷۔ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ اور تاتاری یلغار، مولانا محمد اسماعیل ریحان، المنھل 2012ء ص33۔
۸۔ ایضاً، ص43۔
۹۔ آخری چٹان، نسیم حجازی، جہانگیر بکس، کراچی، ص479۔
۱۰۔ شاہین، نسیم حجازی، جہانگیر بکس، کراچی، ص29۔
۱۱۔ ایضاً، ص 277، 276، 275، 274، 273، 272۔
۱۲۔ ایضاً، ص521۔
۱۳۔ معظم علی، نسیم حجازی، جہانگیر بکس، کراچی، ص442، 443۔
۱۴۔ ایضاً، ص558، 557، 556، 555۔
۱۵۔ سو عظیم مسلمان فاتحین، شاہد محمود، مشتاق بک کارنر، لاہور ص523۔
۱۶۔ ایضاً، ص523۔

☆☆☆☆☆